رسائل و مسائل

کیا لاشے بات سنتے ہیں؟

سوال :- ایک حدیث میں ابی طلحہؓ روایت کرتے ہیں کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جنگ بدر میں کفار کو شکست دینے کے بعد ۲۴ مقتول سرداران کفار کو ایک گندے اور گہرے گڑھے میں پھنکوا کر ان سے خطاب فرمایا کہ اے سرداران قریش جو وعدہ خدا نے ہم سے کیا تھا وہ اس نے پورا کر دیا، کیا وہ وعدہ جو خدا نے تم سے کیا تھا وہ بھی پورا ہو گیا؟ فقال عمرؓ "یا رسول اللہ! ما تکلم من اجساد لا ارواح لھا؟ اے خدا کے رسول! کیا آپ ایسے لاشوں سے گفتگو فرما رہے ہیں جن میں ارواح باقی نہیں؟ آنحضور صلعم نے جواباً فرمایا: "والذی نفس محمد بیدہ ما انتم باسمع منھم ولکن لا یجیبون" "قسم اس ذات کی جس کے دست قدرت میں محمدؐ کی جان ہے تم (میری اس گفتگو کو) ان سے زیادہ سننے والے نہیں ہو، لیکن وہ جواب نہیں دے سکتے۔" (متفق علیہ۔ بخاری و مسلم)

اب آپ قرآن شریف کی طرف بہ نظر غائر دیکھیں اور میرے شبہ کو دور فرمائیں۔ قرآن شریف میں ہے :- وما انت بمسمع من فی القبور (اور آپ قبروں کے گڑے مُردوں کو سنانے پر قادر نہیں ہیں) - دوسری جگہ ہے: فانك لا تسمع الموتیٰ ولا تسمع الصم الدعاء اذا ولوا مدبرین (سو آپ مردوں کو سنا سکنے والے نہیں ہیں، اور نہ بہروں کو اپنی پکار سنا سکنے والے ہیں جبکہ وہ روگردانی کر رہے ہوں)۔" اوکالذی مرّ علیٰ قریۃ کا واقعہ صاف دلالت کرتا ہے کہ یہ مردے نہیں سنتے۔ یہ واقعہ حضرت عزیر علیہ السلام یا کسی اور نبی کا ہے۔ اگر وہ نبی سن سکتے تو سو سال کے طویل عرصہ میں ہزاروں آوازیں آتیں۔ ان کا گدھا ان کے پاس چیخ چیخ

کر مر گیا لیکن وہ نہ سن سکے جب ایک پیغمبر نہ سن سکا تو دوسرے لوگ کیسے سن سکتے ہیں۔ اصحاب کہف بھی اللہ کے نیک بندے تھے تین سو نو سال غار میں پڑے رہے، اور پھر جب خدا نے ان کو زندہ کیا تو انہوں نے بھی تین سو نو سال کے طویل عرصہ کو چند گھنٹے خیال کیا۔ اب آپ ہی انصاف فرمائیں کہ قرآن و حدیث میں کس قدر تعارض و تضاد ہے۔

ممکن ہے کہ آپ مجھے منکر حدیث خیال کرتے ہوئے جواب دینے کی زحمت گوارا نہ فرمائیں لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں نے صحاح ستہ اور کتب فقہ و تفسیر، اصول منطق، ادب و نحو وغیرہ باقاعدہ اسلامی درسگاہوں میں حاصل کیے ہیں۔ بفضل خدا میں حنفی ہوں، لیکن اب دوبارہ قرآن و حدیث کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ اگر آپ نے مجھے قابل التفات نہ سمجھتے ہوئے میرے شبہات کا ازالہ نہ کیا تو شاید میں ان حدیثوں کو ماننے سے انکار کر دوں جو قرآن کے مخالف ہیں۔

جواب - آپ اگر خدانخواستہ منکر حدیث ہوتے تو بھی آپ کے کسی سوال کا جواب اس صورت میں ضرور دیا جاتا جبکہ اس میں اتباع فتنہ اور نامعقولیت کے آثار نہ ہوتے۔ اخلاص کے ساتھ حق کی جستجو کرتے ہوئے اشکال اور شبہات کا پیش آنا اور ان کا حل تلاش کرنا اور چیز ہے اور فاسد ذہن کے ساتھ خواہ مخواہ الجھنیں پیدا کر کے اور دوسروں سے حجت بازی کرنا اور مناظرانہ اسلوب کے ساتھ بدزبانی پر اتر آنا بالکل دوسری صورت ہے۔ پہلی حالت سے سابقہ پڑے تو اپنی استطاعت کے مطابق فہم حق میں ہم ہر مسلمان کو مدد دیتے ہیں، دوسری صورت درپیش ہو تو ہم فضولیات کو درخور اعتنا نہیں سمجھتے۔ ان مشاغل کے لیے ہمارے پاس نہ وقت ہے، نہ توانائی!

پورے شعور کے ساتھ قرآن و حدیث کا جو تقابلی مطالعہ آپ نے شروع کیا ہے یہ بہت قابل قدر ہے۔ درسگاہوں سے بہت سے فارغ التحصیل علماء ہر سال الفاظ کے انبار اور نحو و ادب اور تفسیر و فقہ کی معلومات کے طومار کے طومار دماغ پر لادے اس حالت میں نکلتے ہیں کہ دین کی روح، اس کی حکمت اور اس کے اصولی مسائل کا کوئی شعور ان میں موجود نہیں ہوتا۔ چنانچہ بجائے اس کے کہ یہ علم ان کو حقیقت کے قریب لے جائے الٹا دور ہٹاتا ہے اور وہ یا تو جمود کے کسی غار میں گھس جاتے ہیں، یا فتنے پیدا

کرتے پھرتے ہیں، یا پھر فتنہ گروں کے کسی طلسم میں پھنس کر رائگاں عمریں گذار دیتے ہیں۔

منکرین حدیث نے خدا کے دین کے خلاف جو مہم شروع کر رکھی ہے وہ یہ تاثر پیدا کرتی ہے کہ فی الجملہ احادیث قرآن سے متعارض ہیں، اور احادیث کے دفتر ایک سازش کے طور پر مدون کر کے دین کا حلیہ بنا دیے گئے ہیں۔ حالانکہ پوزیشن بالکل برعکس ہے۔ فی الجملہ دفاتر احادیث ایمان و حکمت کے جواہر بے بہا کے خزائن ہیں۔ علم کے ان درخشاں موتیوں میں سے ایک ایک کی قدر و قیمت کی گواہی قرآن خود دیتا ہے۔ کہیں اکا دکا کوئی سنگ ریزہ بھی ان میں باوجود چھان پھٹک کے باقی رہ گیا تو رہ گیا۔ ایسے سنگ ریزوں کو روایت و درایت، اور قرآن اور سنت کے مجموعی شعور کی کسوٹیوں کے ذریعے الگ کیا جا سکتا ہے۔

یہ مہم جس فن لطیف کے ساتھ چلائی جا رہی ہے وہ اپنے اندر بڑے دلچسپ انداز رکھتا ہے۔ حدیث پر حملہ کے حسب ذیل طریقے اختیار کیے گئے ہیں:۔

—— وہ روایات جن کے بارے میں پہلے سے ہمارے علماء و ائمہ کی تحقیق یہ ہے (اور اس کا تحریری ریکارڈ موجود ہے) کہ فلاں فلاں روایات ضعیف یا ناقابل استناد ہیں، ان کو نمک مرچ لگا کر سامنے لایا جاتا ہے۔

—— وہ روایات جن پر محققین نے خود ہی اعتراضات عائد کر کے پھر ان کے جواب دینے کے بعد ان کی پوزیشن صاف کر دی ہے، ان میں سے بعض کو لے کر محققین کے اٹھائے ہوئے اعتراضات کا حصہ، کبھی حوالوں کے ساتھ اور کبھی اپنی طرف سے پیش کر کے جواب کا حصہ لگاہوں سے اوجھل چھوڑ دیا گیا ہے۔

—— وہ روایات جن سے قرآن کے مطابق کوئی مفہوم اخذ ہونے کے ساتھ کوئی مکروہ قسم کی تاویل کی جا سکتی ہو، ان کے لیے قرآنی مفہوم کو دانستہ پیچھے ڈال کر ایک مکروہ تاویل کو ابھار دیا جاتا ہے۔

—— ایسی افسوسناک مثالیں بھی موجود ہیں جن میں ایک حدیث کے اندر لغت و ادب اور دوسری ساری پابندیوں سے بے نیاز ہو کر ایک نامعقول مفہوم اپنی طرف سے داخل کر دیا گیا ہے۔

اس طرح اثر یہ پیدا کیا جا رہا ہے کہ فی الجملہ احادیث کے خزائن میں کھوٹا مال بھرا پڑا ہے اور جو اس اثر میں آجاتا ہے وہ احادیث پر پہلی نگاہ اعتماد کی نہیں، شک و شبہ کی ڈالتا ہے۔ آپ کے دونوں سوالات کو سامنے رکھنے سے یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ اس طرح کا زاویۂ نظر آپ کے اندر نہ ابھر رہا ہو۔ یہ زاویۂ نظر اگر ایک بار پیدا ہو جائے اور ایک ایک حدیث کو آدمی مشکوک قرار دے کر اسے زیر بحث لانے کے چکر میں پڑ جائے تو اس کی ساری عمر گذر جائے گی لیکن سنتِ نبویؐ اور اسوۂ حسنہ کے بارے میں مجموعی حیثیت سے وہ ایمان کبھی نصیب نہ ہوگا جس کے بغیر اطاعتِ رسول صلعم کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔[1]

آپ منکرینِ حدیث کے پروپیگنڈے میں سے تجزیہ کر کے وہ اصولی اختلاف برآمد کریں جو بحیثیتِ مجموعی ان کو نظامِ دین و شریعت سے ہے اور پھر اس اختلاف کو اصولی حیثیت سے اِدھر یا اُدھر کسی ایک طرف ختم کر کے یکسو ہوں۔ اگر آپ یہ تسلیم کریں کہ سنتِ رسولؐ ماخذِ شریعت ہے اور یہ مانیں کہ حدیث سنتِ نبوی کا زیادہ سے زیادہ حد تک قابلِ اعتماد ریکارڈ ہے تو پھر فی الجملہ اس ریکارڈ کو بھروسے کے ساتھ لیں اور اسے ایمان و حکمت حاصل کرنے کے لیے پڑھیں۔ جہاں کہیں کھٹک پیدا ہو، وہاں محدثین کی کتابوں اور اہلِ علم سے مدد لے کر معلوم کریں کہ کسی روایت کا اسنادی درجہ کیا ہے اور اس کے مفہوم کی تاویلِ احسن کیا ہو سکتی ہے جو اسے قرآن و سنت کے فریم میں کسی ٹھیک مقام پر نصب کر دے۔ ان مراحل کو طے کر جائے پر بھی اگر ایک روایت قرآن سے تضاد رکھتی ہو تو حق یہی ہے کہ اسے بالائے

---

[1] یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے کسی شخص کو کوئی فتنہ گر آکر یہ کہے کہ تو جس مکان میں رہتا ہے وہ تیرے باپ نے تمام تر حرام کمائی سے بنایا ہے اور پھر وہ کبھی اس کی کسی اینٹ کے بارے میں یہ شبہ پیدا کرے کہ یہ مال مسروقہ ہے اور کبھی اسکی کسی کڑی کے بارے میں یہ شک پیدا کرے کہ یہ فلاں جگہ سے غصب کر کے لائی گئی ہے۔ مخاطب اگر سلیم الدماغ ہو تو وہ پہلے یہ طے کریگا کہ اس کا باپ حرام خور تھا بھی یا نہیں اور اگر اسے یقین ہوگا کہ اس کا باپ حلال کی حدود کا پابند تھا تو وہ ایک ایک اینٹ اور ایک ایک کڑی کے بارے میں شبہات میں مبتلا ہونے کے بجائے فتنہ گر کو دھتکار کر اپنے کام میں لگ جائیگا۔ لیکن ایک سادہ لوح اگر فتنہ گر کے چکر میں آگیا تو وہ اینٹوں اور کڑیوں میں سے ایک ایک کی تفتیش میں پڑ کر اپنی پوری عمر صرف کر بیٹھے گا اور کرنے کا کوئی کام اس کے ہاتھوں نہ ہو سکے گا۔

طاق رکھدیں۔ نہ یہ کہ جو حدیث اپنے جی کو نہ لگی، یا جس کے مفہوم کو سمجھنے میں کوئی دقت پیش آئی اس پر جھٹ سے قرآن سے تضاد رکھنے کی مہر لگا دی۔

اب آیئے اصل بحث کی طرف۔ جس روایت کو آپ نے پیش کیا ہے وہ سمع موتیٰ کی بحث سے گہرا تعلق رکھتی ہے۔ یہ مسئلہ جھگڑے کے اختلافی مسئلوں میں سے ایک ہے اور اسے مناظرہ آراؤں نے خوب خوب رگیدا ہے۔ ان جھگڑوں کی وجہ سے خود یہ اور اس سلسلے کی دوسری روایات بھی اختلافات کا اکھاڑا بن گئی ہیں لیکن حقیقت قرآن اور حدیث دونوں کی رُو سے بالکل صاف ہے۔

عالم برزخ سے گذرنے والوں کو جو احوال و کوائف پیش آتے ہیں ان کو قرآن اور حدیث کی جملہ تفاصیل کی روشنی میں زیر غور لایئے تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ یہ سب معاملات اجساد سے نہیں ارواح سے متعلق ہیں، اور ارواح کے معاملات کو زمان و مکان کے اُن تصورات کی عینک سے دیکھنا مغالطہ پیدا کرتا ہے جو ہماری موجودہ مادی زندگی میں ہمارے ذہن پر مسلط ہیں۔ ہم عالم برزخ کی خبروں کو اسی مادی زندگی کی اصطلاحات (TERMS) کے ساتھ ذہن نشین کرنا چاہتے ہیں اور ٹھوکر کھاتے ہیں۔ ہمارے نزدیک عالم برزخ ایک قبر[1] کے رقبے میں واقع ہے اور روح پر جو کچھ گذرتی ہے اس کا تصور باندھتے ہوتے مادیت کے خوگر ذہن کی وجہ سے مجبور رہتے ہیں کہ روح و جسد میں حیات ارضی کے نمونے پر جوڑ لگا دیں۔ جسد سے آزاد روح کا تصور کرنا ہمارے ذہن کی عادت کے خلاف ہے یہیں سے ساری غلط فہمیاں شروع ہوتی ہیں۔ ہم ایک قبر کو دیکھ کر خیال کرتے ہیں کہ مردہ اسی کے رقبے میں عالم برزخ کی منازل کو طے کر رہا ہے اور اپنے اُسی مادی جسد کے ساتھ طے کر رہا ہے جو اس قبر میں مدفون ہے پھر انہی غلط فہمیوں کے ساتھ ہم اُس عالم سے متعلق آیات و احادیث کا مطالعہ کرتے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ طرح طرح کے اشکالات میں الجھتے ہیں اور گوناگوں سوالات ہمیں چاروں طرف سے گھیر لیتے ہیں۔ انہی اشکالات میں سے ایک سمع موتیٰ کا مسئلہ ہے۔

---

[1] احادیث میں بھی ہمارے مادی ذہن کی رعایت سے عالم برزخ کے احوال کو احوال قبر کے پیرائے میں پیش کیا گیا ہے، لیکن قبر سے مراد وہاں وہ گز رقبۂ زمین نہیں، کیونکہ بہت سے مُردوں کو سرے سے قبر نصیب ہی نہیں ہوتی۔ حالانکہ احوال قبر کا سامنا ہر ایک کو کرنا ہوتا ہے۔

ارواح کے بارے میں یہ حقیقت واضح ہے کہ ان کو قبروں میں نہیں بلکہ سجین اور علیین میں رکھا جاتا ہے جو عالم ارواح کے دو بڑے شعبے ہیں۔ ایک کی نوعیت حوالات کی سی ہے جس میں مجرمین کی ارواح قید میں ڈال دی جاتی ہیں، دوسرے کی حیثیت شاہی مہمان خانے کی سی ہے جہاں مقربین و صالحین کی ارواح کو سرکاری مہمان (STATE GUEST.) بنا کر رکھا جاتا ہے۔ یہ دونوں کے دونوں گروہ اپنے نتائج اعمال پانے کے لیے اللہ تعالیٰ کے شاہی دربار کے انعقاد کا انتظار کرتے ہیں۔ قرآن سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دونوں شعبوں کی ارواح کے روابط عالم مادی سے کٹ جاتے ہیں۔ "سمع" انسانی اصطلاح میں حرف و صوت کے جس سسٹم پر مبنی ہے اس کے کام کرنے کا انحصار ہوا کی لہروں اور آلۂ گوش کے طبل کی حساسیت پر ہے۔ ایک میت کا جسدی جب لقمۂ خاک ہو گیا، اس کا طبلِ گوش ہی ناکارہ ہو گیا، اس کے نظامِ اعصاب اور حسیات ہی کو جب معطل کر دیا گیا اور ہوا کی لہروں کو روکنے کے لیے جب تودۂ ہائے خاک راستے میں حائل ہو گئے تو وہ سسٹم برقرار رہا ہی کب جسے ہم اپنے لغت میں لفظ "سمع" سے بیان کرتے ہیں۔

نبی صلعم کے حضور سے چند ایسی روایات ہم تک پہنچتی ہیں کہ جن کے اندازِ بیان سے سمع موتیٰ کے اثبات کا شبہ ہوتا ہے۔ چنانچہ ان روایات کے ساتھ ہی ساتھ ہم تک خود صحابۂ کرام کا استعجاب و اضطراب بھی پہنچتا ہے جو ان کو سن کر معاً پیدا ہوا اور اسی وجہ سے پیدا ہوا کہ ایک مسلمہ حقیقت کے خلاف ایک مفہوم سامنے آتا تھا۔ لیکن ان روایات کے ساتھ وہ تاویل بھی ہم تک پہنچتی ہے جس کے ذریعے صحابہ کا اطمینان ہو گیا۔ یہاں باقی ساری روایات کو درکنار رکھ کر خاص طور پر آپ کی پیش کردہ حدیث پر گفتگو کی جاتی ہے۔ بتایا گیا ہے کہ چوبیس اکابر کفار کو گڑھے میں ڈلوانے کے بعد آپ اس کے کنارے کھڑے ہوئے اور ان میں سے ایک ایک کا نام اور اس کے باپ کا نام پکار کر فرمایا کہ "اے فلاں ابن فلاں، اے فلاں ابن فلاں! کیا تمہارے لیے خوش آئند نہ ہوتا، اگر تم نے خدا اور اس کے رسول کی اطاعت کی ہوتی؟ پس ہم نے تو درست پایا جو کچھ اللہ نے ہم سے وعدہ کیا تھا، تو کیا تم نے بھی اللہ کے کیے ہوئے وعدے کو برحق پایا؟"

روایت اگر اتنی ہی ہوتی تو اس کی یہ توجیہ کافی تھی کہ بسا اوقات کسی بے جان شے کی طرف

روئے سخن کرکے ایسی بات کہی جاتی ہے جس کا اصل مخاطب آدمی خود اپنے آپ کو بناتا ہے یا دوسرے سامعین کو۔ یہ اسلوب دنیا کا ایک معروف اسلوب ہے۔ اس کی ایک واضح مثال حضرت عمرؓ کا حجر اسود کو مخاطب بنا کر یہ کہنا ہے کہ یاد رکھ تو محض ایک پتھر ہے، ہمارا معبود نہیں، ہم تجھے بوسہ اس لیے دیتے ہیں کہ آنحضور صلعم نے ایسا کیا ہے (او کما قال) اس قول کے ذریعے پتھر کو متاثر کرنا مطلوب نہ تھا بلکہ ایک حقیقت کو حضرت عمرؓ اپنے ذہن میں راسخ کرنا چاہتے تھے، نیز اپنے رفقائے دین کو اس کا گہرا احساس دلانا چاہتے تھے۔ ٹھیک یہی توجیہ آنحضور صلعم کے اس تکلم کی کی جاسکتی ہے جو آپ نے سرداران کفار کے لاشوں سے فرمایا۔ لیکن روایت میں ایک جزء اور بھی ہے۔ آنحضور کے تکلم پر حضرت عمر چپ نہ رہ سکے اور آپ نے بے روح اجساد سے تکلم کیے جانے پر تعجب کا اظہار کیا۔ اس پر آنحضور صلعم نے فرمایا:۔

والذی نفس محمد بیدہٖ ما انتم	اس ذات کی قسم جس کے پنجے میں محمدؐ کی جان ہے،
باسمع لما اقول منھم	جو کچھ میں کہہ رہا ہوں اسے تم ان سے بڑھ کر سننے والے نہیں ہو!

بظاہر ان الفاظ سے ایسا ہی محسوس ہوتا ہے کہ لاشے سُن رہے تھے اور اس روایت سے ایک سرسری نگاہ رکھنے والا قاری یہ نتیجہ نکال سکتا ہے کہ مُردے اور لاشے سنتے ہیں۔ لیکن بخاری کے اسی سلسلۂ باب میں، جہاں یہ روایت مذکور ہے وہاں وہ روایات بھی تو ہیں جو صحابہ کے فہم روایت کو سامنے لاتی ہیں۔ حضرت قتادہ اس کی یہ تاویل پیش کرتے ہیں کہ احیاھم اللہ حتی اسمعھم قولہ توبیخا و تصغیرا و حسرۃ وندما۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے ان لاشوں میں وقتی طور پر زندگی کی رَو دوڑا دی اور ان کے حسِ سماعت کو بیدار کردیا، تاآنکہ ان کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں سُنوا دیں۔ اس سے مقصود ملامت و تذلیل تھی اور پشیمانی اور ندامت کے احساسات کا اُبھارنا تھا۔ جس شخص سے براہِ راست ٹکر لیتے ہوئے ان کی ساری عمریں گذری تھیں، اسی کے روبرو پڑے ہوئے اسی کی زبان سے ایک طرف یہ سننا کہ چکھ لیا مزہ اپنے کرتوتوں کا، اور دوسری طرف عالم آخرت میں اس کی دی ہوئی

پیشگی اطلاع کے مطابق جہنم کے شعلوں کی لپک کو آنکھوں سے دیکھنا انتہائی ذلت و نامرادی کا سماں پیدا کر دیتا ہے۔ بہرحال حضرت قتادہ اس صورتِ واقعہ کو معجزے کی حیثیت دیتے ہیں کہ خاص رسولؐ اللہ کے لیے اس خاص لمحے ایک عمومی حالت کو بدل دیا گیا۔ اس توجیہ میں کوئی اشکال نہیں نظر آتا۔ اگر معجزانہ حیثیت سے موسیٰ علیہ السلام کے خطاب کو لکڑی کا ایک عصا سن سکتا ہے اور آپؐ کے ارشادات کی تعمیل کر سکتا ہے اور اس سے قرآن میں تضاد واقع نہیں ہوتا تو اس بات میں کیوں عدمِ امکان مانا جائے کہ آنحضورؐ چند لاشوں کو خطاب کریں اور وہ اسے ٹھیک اس طرح سنیں جیسے ایک زندہ انسان سنتا اور متاثر ہوتا ہے۔ اس چیز کی وجہ سے قرآن اور حدیث میں تضاد و تناقض کا ہونا کیوں تسلیم کر لیا جائے؟

دوسری توجیہ وہ ہے جو حضرت عائشہؓ نے فرمائی۔ ہشام کے والد نے ابن عمرؓ کے حوالے سے نوحہ کرنے اور مردے پر عذاب ہونے والی روایت حضرت عائشہ کی خدمت میں سمجھنے کے لیے پیش کی۔ حضرت عائشہ نے اس کا مطلب واضح کرتے ہوئے اسی بدر کے واقعہ کو بطور مثال لیا۔ آپؓ نے لاشوں کے سمع کا صحیح مفہوم پیش کرنے کے لیے نبی صلعم کے قول کے اصل مدعا کو ذیل کے الفاظ سے بیان کیا:

انھم الآن لیعلمون ان الذی کنت اقول لھم ھو الحق یعنی یہ لوگ اب خوب سمجھ گئے ہیں کہ جو کچھ میں ان سے کہتا رہا تھا وہی حق تھا۔ زندگی میں میری جس دعوت کو یہ سننے پر تیار نہ ہوئے اُسے یہ آج خوب سنتے ہیں۔ گویا حضرت عائشہ بات کو یوں سمجھاتی ہیں کہ عالمِ ارواح یا عالمِ برزخ میں وہ لوگ ٹھیک اس انجام سے دوچار تھے جس کی خبر آنحضرتؐ نے دی تھی اور وہ آپ کی دعوت کی سچائی کو خوب جان چکے تھے "یسمعون" بمعنی "یعلمون" اس لیے لایا جاتا ہے کہ سماعت ذریعۂ علم ہے، سنانا ہوتا ہی کسی حقیقت کا علم دینے کے لیے ہے۔ سو بدر کے مقتول سردارانِ کفار اس حقیقت سے براہِ راست دوچار تھے جس کے لیے نبی صلعم نے پوری کوشش کی کہ پردۂ غیب کے قائم رہتے ہوئے وہ اُسے آپ سے سن کر پائیں۔ اللہ کا وعدہ ایک

طرف مسلمانوں کے ساتھ پورا ہوا اور دوسری طرف ان مقتولین اور ان کے پیروؤں کے ساتھ!

پھر ابن عمرؓ اصل روایت میں ذرا سے تغیر کے ساتھ یہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم بدر کے گڑھے پر رکے اور کہا: "کیا تم لوگوں نے اپنے رب کے کیے ہوئے وعدے کو برحق پایا؟" پھر فرمایا "جو کچھ میں کہہ رہا ہوں، یہ لوگ اسے خوب سنتے ہیں" ابن عمرؓ نے اس واقعہ کا ذکر حضرت عائشہؓ سے کیا۔ حضرت عائشہؓ نے فرمایا: "انما قال النبی صلعم: انھم الآن لیعلمون ان الذی کنت اقول لھم ھو الحق" یہاں اصل روایت کے الفاظ ہمیں اس مفہوم سے مزید قریب کر دیتے ہیں جسے حضرت عائشہ نے اختیار فرمایا اور پوچھنے والوں کو بتایا۔

ان دونوں موقعوں پر یہ چیز قابلِ توجہ ہے کہ خود حضرت عائشہ "انک لا تسمع الموتی" اور "وما انت بمسمع من فی القبور" کی تلاوت بھی کرتی ہیں جن کا حوالہ آپ نے دیا ہے۔ اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ آپ بھی سمع موتیٰ کی نفی کی قائل نہیں۔ پھر جب حضرت عائشہ کو واقعہ بدر کی روایت اور قرآن میں کوئی تضاد و تناقض نہیں نظر آتا، بلکہ وہ ایک تاویلِ احسن پر مطمئن ہو جاتی ہیں اور دوسرے سائلین کو بھی مطمئن کرتی ہیں تو آخر آج نیا تضاد و تناقض کو نسا واقع ہو گیا۔

یہ دونوں توجیہات بالکل معقول اور قرینِ فہم ہیں اور ان میں سے جسے بھی اختیار کیا جائے مذکورۂ بالا روایت کتاب الٰہی اور سنتِ نبوی کے فریم میں ٹھیک ٹھیک نصب ہو جاتی ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ ان دونوں توجیہات سے کنی کاٹ کر ایک ایسا مدعا اخذ کیا جائے جو خواہ مخواہ تضاد و تناقض ہی کو پیدا کرنے والا ہو۔ یہ طریقہ تو منکرینِ حدیث کا امتیازی (TYPICAL) معمول ہے کہ وہ بالکل آنکھوں کے سامنے موجود تاویلِ احسن کے لیے اپنے آپ کو اندھا بنا کر ابتغائے فتنہ کی وادیوں میں بھٹکتے پھرتے ہیں۔

خدا ہمارے لیے اور آپ کے لیے امرِ حقیقی کے فہم کے دروازے کھول دے!

مزید اشکالات

سوال:۔ ترجمان القرآن ماہِ اگست ۱۹۵۴ء میں "چند اشکالات" کا جو جواب ادارہ کی طرف سے شائع کیا گیا ہے اس کے متعلق چند معروضات ارسالِ خدمت ہیں۔ امید ہے کہ ان کا جواب باصواب عنایت فرما کر عند اللہ ماجور ہونگے۔

(۱) جن حوادث کی خبر ایک صاحب وحی نے اتمامِ حجت کے بعد یا کسی کے مرنے جینے کے متعلق قبل از وقت دی ہو، کیا وہ مرنا اور جینا، فتح و شکست "علم حقیقت" کی رُو سے حق و باطل کا معیار ہے یا نہیں؟

(۲) اگر اس دنیا میں عقیدۂ صحیحہ اور اپنا کردار مذہبِ حقہ کے مطابق رکھنے والوں میں اور باطل کے پرستاروں میں فراخ دستی یا تنگ دستی سے دوچار ہو جانا معیارِ حق و باطل نہیں تو فرمائیں یہ جو حضرت نوحؑ اور حضرت ہودؑ کی زبانی اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر تم لوگ میری اطاعت کروگے اور اللہ تعالیٰ سے استغفار طلب کروگے تو اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچ جاؤ گے اور مقررہ میعاد تک تم کو مہلت ملے گی، وقت پر اللہ تعالیٰ تمہارے لیے بارشیں برسائے گا۔ اور مال و اولاد سے تمہاری مدد کرے گا۔ (۵۲/۱۱ ، ۱۲،۱۱،۱۰/۷۱) کیا یہ فراخی اور تنگیٔ رزق وغیرہ کے وعدے مذہبِ حقہ کے مطابق کردار رکھنے کا نتیجہ نہیں؟

(۳) اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسے بیّن نشانات کے اظہار سے، جس سے حق و باطل میں فرق ہو جائے بقول آپ کے انسان کی وہ آزادیٔ رائے ختم ہو جاتی ہے جو اسے ذمہ دار ہستی بنا کر قابلِ سزا یا سزاوارِ جزا بناتی ہے (اور) . . . اکراہ فی الدین کی حالت قائم ہو جاتی ہے۔ تو پھر فرمائیں آپ کے سابق امیر صاحب نے جو قرآن کی طرف، یہ تعلیم منسوب فرمائی ہے کہ "یہ امت خدائی فوجداروں کی جماعت ہے (حالانکہ اللہ تعالیٰ نے نبی کریمؐ کے متعلق فرمایا لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ یعنی آپ لوگوں پر داروغہ نہیں ہیں) جو اس لیے نکالی گئی ہے کہ وہ دنیا سے

ظلم (بڑا ظلم اللہ تعالیٰ نے شرک بتایا ہے) فتنہ، طغیان اور ناجائز استفاع کو بزور مٹا دے۔"
(فتنہ سے آپ کی مراد عقاید باطلہ ہیں) کیا اس کو زبردستی مٹانا اکراہ فی الدین نہیں؟ دوسری عبارت
یہ ہے کہ" . . . . . اور خدا نے رسولؐ کو دنیا میں زندگی بسر کرنے کا سیدھا راستہ اور حق کی اطاعت
کا صحیح ضابطہ دے کر بھیجا ہے تاکہ تمام اطاعتوں (یہ لفظ دین کا ترجمہ کیا گیا ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ
نے دوسری طرف صاف طور پر مدینہ میں یہ حکم دیا تھا کہ لا اکراہ فی الدین، یعنی اطاعت کے صحیح ضابطہ
کو منوانے کے لیے جبر نہیں کرنا) کو مٹا کر ایک اطاعت (یعنی دین اسلام) کو سب پر غالب کر دے۔"
کیا اس حکم سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اللہ تعالیٰ انسان کی وہی آزادیٔ رائے ختم کرنا چاہتا ہے، کیا
اس صورت میں قرآنی تعلیم میں اختلاف ثابت نہیں ہوتا؟

(۴) افسوس ہے کہ آپ لوگوں نے "شمع ناموس کے پروانوں" کو ایک طرف صحابہ سے
مشابہت دی ہے اور دوسری طرف بہت بڑے پیمانہ پر وہ عیوب بھی گنے ہیں جن سے ان کی
مشابہت مغضوب علیہم قوم سے ثابت ہوتی ہے۔ کیا اس امر سے صحابہ کی توہین کا ارتکاب
نہیں کیا گیا؟

(۵) آپ کو جب یہ مسلّم ہے کہ حق و باطل میں لمبی کشمکش ہوتی ہے اور کسی ایک لہر یا واقعہ
کی کروٹ پر حکم قطعی نہیں لگایا جا سکتا کہ اب آخری فیصلہ ہو گیا ہے تو کیا اس امر سے یہ حکم
لگانا کہ "قادیانیت . . . . . کے زوال کے آثار بالکل عیاں ہو گئے ہیں" آپ کی اپنی بیان
کردہ حقیقت کی تردید نہیں؟

شجرۂ خبیثہ کی جو تعریف بیان کی گئی ہے وہ درست ہے —— مگر یہ بتائیے کہ کیا
اس شجر کے شجرۂ طیبہ ہونے میں آپ لوگوں کو کوئی شک ہے جو لپن صدی سے اپنے تنے پر
کھڑا ہے جس کی جڑیں اس قدر گہری زمین میں اتر چکی ہیں کہ سارے پاکستان کے ملّا نے اس
کے اکھیڑنے سے عاجز ہو چکے ہیں۔

(۶) آپ کی طرف سے تو فَتَعَال علینا کی جو تاویل کی گئی ہے وہ سراسر غیر معقول ہے۔

جواب - آپ کے مکتوب میں سے وہ حصہ ہم نے ساقط کر دیا ہے جو سوالات پر نہیں بلکہ تادیانیت کی صداقت و عظمت کی تبلیغ پر مشتمل ہے۔ سوالات میں سے بھی کہیں کہیں غیر ضروری حصے حذف کر دیے گئے ہیں۔ آپ کی عبارت کی بے ربطی اور اس کے گنجلک پن پر ہمارا کوئی بس نہیں تھا، لہٰذا اس کا بار خود قارئین کو اٹھانا پڑے گا۔ جواب علی الترتیب درج ذیل ہیں:۔

(۱) جی ہاں بشرطیکہ خبر دینے والا فی الواقع صاحبِ وحی ہو۔ لیکن تمام اخبارِ غیب اور تمام معجزات منکرینِ حق کے لیے اپنے اندر گنجائشِ تاویل ضرور رکھتے ہیں۔ امورِ طبعی میں فریبِ نفس نہیں چلتا، کیونکہ ایک سبب کا ایک ہی نتیجہ صراحت کے ساتھ بار بار تجربہ میں آکر اپنی واقعیت منوا لیتا ہے، لیکن امورِ دینیہ میں افراد برسوں تک اور قومیں صدیوں تک فریبِ نفس میں مبتلا رہتی ہیں۔

(۲) یقیناً دینِ برحق پر چلنا اور اس کے غلبہ کی جدوجہد کرنا انسان کو اس نظامِ خیر و برکت تک پہنچا دینے کا ذریعہ ہے جس سے حیاتِ طیبہ حاصل ہوتی ہے۔ لیکن اس جدوجہد کے دوران میں افراد کو طرح طرح کے مظالم اور ابتلاؤں میں سے گزرنا پڑتا ہے، اور بسا اوقات سالہا سال اس میں صرف ہوتے ہیں۔ اس جدوجہد کے دوران میں کسی فرد کے تنعم یا ابتلاء کو دیکھ کر فوراً یہ فیصلہ نہیں صادر کیا جا سکتا کہ وہ تو متبعِ حق ہے اور یہ منحرف۔ اسے نیکی کی جزا مل رہی ہے اور اسے بدی کی سزا۔ یہ حقیقت اگر آپ تسلیم نہ کریں تو بڑے اشکال پیدا ہوں گے۔ مثلاً غلبۂ دین کی جدوجہد کے دوران میں جو کچھ حضرت نوح علیہ السلام، حضرت زکریا علیہ السلام، حضرت یحییٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور دوسرے انبیاء اور ان کے رفقاء پر گذری اور اس کے مقابل میں جو ٹھاٹھ باٹھ مخالفینِ حق کے تھے اس کے بارے میں کیا رائے قائم کی جائے گی؟ آنحضور صلعم کے پیروؤں کو دورانِ جدوجہد میں کیا حالات پیش آئے اور ان کے حریفوں کا عالم کیا تھا؟ پھر صحابہ میں سے وہ بھی تھے جو اسلام کے قبول کرنے میں جس دورِ ابتلا سے دوچار ہوئے اسی میں وہ شہادت کی منزل کر جا پہنچے۔ ان کی زندگی میں کہاں سے فراوانیٔ رزق اور تمکن فی الارض اور دوسرے انعاماتِ الٰہی کا مظاہرہ آپ تلاش کر کے نکالیں گے؟ امام حسینؓ، امام مالک، امام احمد بن حنبل اور امام ابو حنیفہ کی صف کو ایک طرف کھڑا کر کے اور دوسری طرف

بنو امیہ کے حکمرانوں کو سامنے لاکر غور کیجیے کہ آپ کے نقطۂ نظر سے فریقین کی پوزیشن کیا قرار پاتی ہے؟ مجدد الف ثانی، شاہ ولی اللہ، شاہ اسمٰعیل شہید، اور سید احمد شہید بریلوی رحمہم اللہ اجمعین کو اکبر اور جہانگیر اور سلطنتِ برطانیہ اور سکھوں کی حکومت کے بالمقابل جدوجہد کی حالت سے گزرتے ہوئے تاریخ میں ملاحظہ فرمائیے اور پھر مسئلہ کو سوچیے۔ دو اصولی باتیں یاد رکھیے:۔

—— دینِ برحق پر چلنے کے نتائج حسنہ دنیا میں پوری طرح اجتماعی زندگی میں ظہور پذیر ہوتے ہیں۔

—— یہ نتائج بھی جدوجہد کی تکمیل پر برآمد ہوتے ہیں، جدوجہد کے دوران میں گوناگوں حالات سے گذرنا پڑتا ہے۔

(۳) نبی صلعم کی ایک حیثیت تھی داعی کی، دوسری حیثیت تھی ایک سوسائٹی کے معمار اور ایک ریاست کے منتظم کی۔ پہلی حیثیت میں آپ کے سارے کام کا دارومدار مجرد دلیل کے ذریعے افہام و تفہیم پر تھا۔ دوسری حیثیت میں آپ نے جنگیں کیں اور تلوار کے ذریعے فتنہ و فساد کی روک تھام کی۔ عدالت کی کرسی پر تشریف فرما ہوئے اور قانون کے کوڑے کو حرکت دے کر جرائم کی روک تھام کی یعنی جہاں تک اسلام کے عقیدہ و فلسفہ کو منوانے کا تعلق ہے اس میں جبر روا نہیں رکھا گیا، لیکن جہاں تک اسلام کے اجتماعی نظام کو چلانے کا معاملہ ہے پوری کی پوری اجتماعی قوت اس کام میں استعمال کی گئی۔

لست علیہم بمصیطر کا تعلق کارِ دعوت سے ہے۔ لیکن اجتماعی نظام کے تقاضوں کے لحاظ سے آپ کو احکام دوسرے دیئے گئے، مثلاً یہ کہ یا ایہا النبی جاہد الکفار والمنافقین و اغلظ علیہم، یا مثلاً وان احکم بینہم بما انزل اللہ۔

آپ براہِ کرم دعوت کے اصولوں اور اجتماعی نظام کے تقاضوں میں فرق کریں۔

(۴) یہ مناظرانہ ذہن کے طرزِ فکر کی ایک افسوسناک مثال ہے۔ ایک شخص اللہ کی ایک سنت کو معلوم کرنے کے لیے انبیاء اور صحابہ کی دعوت و تحریک کا مطالعہ کرتا ہے اور پھر اس سنت کو سامنے رکھ کر اپنے گرد و پیش کے احوال کے بارے میں رائے قائم کرتا ہے، اس پر آپ فرماتے ہیں کہ اس نے

عام مسلمانوں کو جس میں اچھے جذبات کے ساتھ عملی کمزوریاں بھی ہیں، اور ان کمزوریوں کو ہم اس لیے سامنے لاتے ہیں کہ ان کی اصلاح ہو) صحابہ سے مشابہت دے کر صحابہ کی توہین کر دی۔ انہی باتوں سے قادیانی ذہن پہچانا جاتا ہے۔

(۵) اس سوال کا جواب انہی سطور میں موجود ہے جن کو دیکھ کر آپ نے یہ نئے سوالات اٹھائے ہیں۔ بہت سے اشجار خبیثہ دنیا میں ایسے موجود ہیں جو ہزار ہزار سال سے اپنے تنوں پر کھڑے ہیں اور بہت سے گمراہ گروہوں کا حال یہ ہے کہ کئی قرنوں سے ان کی تجارتیں چمک رہی ہیں، ان کا رہن سہن عیاشانہ اور پرتنعم ہے اور ان کو دوسروں پر تسلط و اقتدار حاصل ہے۔ لیکن یہ لمبی لمبی مدتیں قانونِ الٰہی کی نگاہ میں بالکل حقیر ہیں اور یہ گروہ آہستہ آہستہ اپنے انجام کی طرف بڑھتے جا رہے ہیں۔ پھر بھی آپ کو اگر قادیانیت کے شجرۂ طیبہ ہونے کا اور اس کے پھلنے پھولنے کا یقین ہے تو معاملہ بحث کا نہیں، اس پر تو یہی کہا جا سکتا ہے کہ تربصوا فانی معکم من المتربصین!

آپ نے اپنی جماعت سے اختلاف کرنے والے علماء اور قائدین کے لیے "ملّانے" کا لفظ استعمال کر کے کسی اچھے شریفانہ ذہن و اخلاق کا مظاہرہ نہیں کیا۔ آدمی کو اپنی زبان ہمیشہ پاکیزہ و مہذب رکھنی چاہیے۔ اور اختلاف کرنے والوں کے جذبات پر نشتر چلا چلا کر ایسے اسباب پیدا نہیں کرنے چاہئیں جن سے عام ذہنی و خارجی فضا مکدر ہو کے رہ جائے

(۶) میری درخواست یہ ہے کہ ایک بار پھر اس آیت کی تشریح پر نظر ڈالیے اور اس کے بعد دوبارہ اپنے سوال کا جائزہ لیجیے۔ آپ نے غور نہیں فرمایا کہ دو مختلف صورتیں الگ الگ بیان کی گئی ہیں، ایک یہ کہ ایک عام آدمی اللہ تعالیٰ کے بارے میں افترا کرے، دوسرے یہ کہ ٹھیک وہ شخص اللہ تعالیٰ کے بارے میں افترا کرے جسے اللہ نے مامور ہی اس کام پر کیا ہو کہ وہ مفتریوں کے کیے کرائے کو ختم کرنے کے لیے امرِ حق کی تبیین کر دے۔ دونوں میں فرق وہی ہے جو ایک عام شہری کے ڈاکہ ڈالنے میں، اور ایک کوتوال کے ڈاکہ ڈالنے میں ہے، یا وہی فرق ہے جو ایک عام آدمی کی خیانت میں اور ایک وزیر کی خیانت میں ہو سکتا ہے۔ قانونِ الٰہی میں ان دونوں صورتوں پر کارروائی مختلف ہوتی ہے آیت

مذکورۂ بالا اختصاص اس صورت سے تعلق رکھتی ہے کہ خدا کا مقرر کیا ہوا ایک نبی و رسول اگر اپنی اتھارٹی اور اپنے عہدہ کا ناجائز استعمال کرتے ہوئے وحی کے پہنچانے میں خیانت کرے اور اپنی طرف سے غلط باتیں خدا سے منسوب کر دے تو اس کے ساتھ اللہ کے قانون کا معاملہ کیا ہوگا! ورنہ مسلمانوں کی تاریخ شاہد ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی کے مطابق اس امت میں متعدد کذابوں نے دعوائے نبوت کیا ہے۔ کیا اللہ تعالیٰ نے اُن میں سے کسی ایک کی بھی گردن کاٹی ہے ؟

آپ اگر ان دونوں صورتوں میں فرق نہیں کر سکتے تو کسی کا آپ پر کوئی زور تو نہیں ہے۔ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۔

اعلان

قارئینِ "ترجمان" میں سے بہت سے حضرات دفتر میں سوالات ارسال فرماتے ہیں اور اپنا مکمل پتہ تحریر کرنے کے بجائے "ترجمان" کے ذریعے جواب کا مطالبہ کرتے ہیں۔ ایسے حضرات کی خدمت میں گذارش ہے کہ ہمارے پاس کثرت سے سوالات آتے ہیں اور ہر سوال کا جواب ترجمان میں دینا نہ ممکن ہوتا ہے اور نہ ضروری اور مناسب۔ اس کے علاوہ بہت سے سوالات کے جوابات کتب و رسائل میں پہلے سے دیے جا چکے ہیں۔ اس لیے آپ سے درخواست ہے کہ سوال کے ساتھ مکمل پتہ بھی لکھ دیا کریں، تاکہ اگر ضرورت ہو تو جواب ذاتی طور پر ڈاک سے بھی دیا جا سکے۔ بصورتِ دیگر جن سوالات کا جواب "ترجمان" میں دینا ممکن نہ ہوگا یا جن کا جواب پہلے دیا جا چکا ہوگا اُن کا جواب کسی شکل میں بھی ہم دینے سے معذور ہوں گے ۔

(ادارہ)